© rasailojaraid.com

شاہ ولی اللہؒ اور مولانا آزادؒ کی تفسیروں کا تقابلی مطالعہ

(۲)

ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی

اسرائیلیات

قرآن کی تفسیر و تشریح میں اسرائیلی روایات سے مدد لی جائے یا نہیں اور اگر لی جائے تو کس حد تک؟ یہ مسئلہ مفسرین کی توجہ کا موضوع رہا ہے، اگرچہ اسرائیلی روایات سے استفادہ کی حمایت شاید ہی کسی مفسر نے کی ہو مگر یہ بھی برحق ہے کہ کم ہی مفسرین کا دامن اسرائیلیات سے پاک رہا ہے۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں:

> "اسرائیلی روایات کا نقل کرنا ایک ایسی بلا ہے جو ہمارے ذہن میں داخل ہو گئی ہے، حالانکہ قاعدہ یہ ہے کہ ان کی نہ تصدیق کرو نہ تکذیب، اس قاعدہ سے دو باتیں معلوم ہوئیں، اول یہ کہ جب تک تعریض کلام اللہ کا بیان حدیثِ نبویؐ میں دستیاب ہو سکے، بنی اسرائیل سے نقل نہ کرنا چاہیے۔ دوسرے یہ قاعدۂ کلیہ ہے کہ ضروری امر اپنی حد تک ہی محدود رہتا ہے، اس لیے اقتضاء تعریض کی مقدار کو ملحوظ رکھتے ہوئے بیان کرنا چاہیے تاکہ اس کی تصدیق ہم قرآنی شہادت سے کر سکیں اور اس سے زیادہ بیان سے زبان کو روکنا چاہیے"[۵۶]

مولانا آزاد اس کلیہ سے بھرپور اتفاق کرتے ہیں اور تفسیری اصولوں کی تفہیم کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ:

> "نومسلم اقوام کے قصص و روایات اول دن سے پھیلنا شروع ہو گئے تھے، ان میں سے اسرائیلیات (یعنی یہودیوں کے قصص و خرافات)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو ہمیشہ محققین نے چھانٹنا چاہا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان عناصر کے مخفی اثرات دور دور تک سرایت کر چکے تھے اور وہ برابر جسم تفسیر میں پیوست رہے۔" ۵۶

تفسیروں میں اسرائیلی روایات کی دراندازی کا شکوہ جو مولانا نے کیا ہے وہ درست ہے اور مولانا نے ایسی روایات سے ترجمان القرآن کو دور رکھا ہے مگر اس کو کیا کیجئے کہ مولانا نے جس فراخ دلی کے ساتھ بائبل یعنی توریت اور انجیل سے استفادہ کیا ہے اور قرآنی مطالب کی گرہ کشائی میں ان سے استشہاد کیا ہے وہ بجائے خود قابل غور مسئلہ ہے چنانچہ سورہ الانبیاء کی آیت وَاَیُّوْبَ اِذْ نَادٰی رَبَّهٗۤ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ (الانبیاء: ۸۳) کی تفسیر میں مولانا آزاد نے پورا انحصار توریت کے باب ایوب پر کیا ہے اور پورے باب کا خلاصہ تقریباً ۶ صفحات میں بلا تکلف نقل کیا ہے۔ ۵۸

مفسرین سلف نہ صرف اسرائیلی روایات کے سلسلے میں محتاط تھے بلکہ توریت و انجیل سے استشہاد کرنے میں بھی محتاط تھے۔ مگر بعد کے مفسرین میں بائبل سے اخذ و استفادہ اور قرآن کی تفسیر میں اس سے استشہاد کا رجحان پیدا ہوا جس کو اسرائیلیات کی دوسری شکل ہی کہا جا سکتا ہے۔ مولانا آزاد نے بائبل کا مطالعہ بار بار کیا ہے اور ترجمان القرآن میں بکثرت اس کے بیانات کا حوالہ دیا ہے، حالانکہ مولانا آزاد کی رائے توریت کے بارے میں یہ ہے کہ:

> "توریت کے بقیہ اجزاء کے بارے میں کچھ ہی کہا جائے، لیکن موجودہ زمانہ میں علم و تحقیق کا قطعی فیصلہ ہو چکا ہے کہ کتاب پیدائش لائق اعتماد نہیں، خصوصاً اس کا ابتدائی حصہ" ۵۹

ایسے موقع پر معتدل و متوازن طرز عمل وہی ہے جس کی طرف شاہ ولی اللہ نے اشارہ کیا ہے۔

شاہ ولی اللہؒ اور مولانا آزادؒ کی تفسیروں میں فرق

شاہ ولی اللہ اور مولانا آزاد کی تفسیروں میں جہاں ہم آہنگی کی مثالیں ملتی ہیں وہاں فرق و اختلاف کی مثالیں بھی موجود ہیں اور یہ فرق متعدد وجوہ اور پہلو رکھتا ہے۔

شاہ ولی اللہ اور مولانا ابو الکلام آزاد کے طریقہ تفسیر میں ایک فرق یہ ہے کہ شاہ صاحب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آیات کی تفسیر کرتے ہوئے بالعموم نزول کے پس منظر، حالات، مسائل اور اسباب پر نظر رکھتے ہیں جبکہ مولانا آزاد آیات کے مطالب، آفاقی پیغام منطقی نتائج اور عمومی اثرات کو اجاگر کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر یہ آیت دیکھئے:

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا (النساء:۵۸) — خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ جو جس کی امانت ہو وہ اس کے حوالہ کر دیا کرو۔

اس کی تفسیر میں شاہ صاحب لکھتے ہیں۔

"اس آیت میں اشارہ ہے عثمان حجبی کے واقعہ کی طرف کہ ان کے ہاتھ سے خانہ کعبہ کی چابی لے لی گئی اور لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ چابی حاصل کرنے کی سعی کی تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قبول نہ کیا اور حضرت عثمان حجبی کو دوبارہ چابی سونپ دی [۵۶]

مولانا آزاد نے اس موقع پر لکھا ہے۔

"اجتماعی زندگی کے نظم و فلاح کے لیے اصل اصول یہ ہے کہ جو جس بات کا حقدار ہو اس کے حق کا اعتراف کرو اور جو چیز جسے ملنی چاہیے وہ اس کے حوالہ کر دو، وارث کا حق ہو، یتیم کا مال ہو قرض دار کا قرض ہو امانت رکھنے والے کی امانت ہو، اہلیت رکھنے والے کے لیے منصب اور عہدہ ہو، کوئی چیز ہو اور کوئی صورت ہو لیکن جو جس کا حق ہے اور جو جس کا اہل ہے وہ اسے ملنا چاہیے۔" [۵۶]

سورہ توبہ میں اہل کتاب سے جنگ کرنے کے سلسلہ میں ارشاد ہے حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَۃَ عَنْ یَّدٍ وَّھُمْ صٰغِرُوْنَ (التوبہ: ۲۹) شاہ صاحب نے اس کا ترجمہ کیا ہے "تا آنکہ بدہند جزیہ از دست خود خوار شدگان" [۶۲]

مسلمانوں سے زکوٰۃ و صدقات لینا اور مفتوح اہل کتاب سے جزیہ لینا برحق ہے مگر "وہم صاغرون" کا ترجمہ شاہ صاحب نے "خوار شدگان" کیا ہے جو مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ بعض فقہاء نے اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اہل ذمہ سے جزیہ لینے کے ساتھ انہیں خاص طرح کے لباس کا پابند بنایا جائے گا اور انہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گھوڑے کی سواری استعمال کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔ یہی رجحان شاہ صاحب کے ترجمہ سے بھی جھلکتا ہے۔ حالانکہ یہ تصور ہی انسانوں سے حسن سلوک اور شریفانہ برتاؤ کی عام قرآنی تعلیمات سے بالکل متصادم ہے۔ صاغرون کا ترجمہ چھوٹا بن کر رہنا یا اسلام کی بالادستی قبول کرنا بھی ہو سکتا ہے مولانا ابوالکلام آزاد نے بجا طور پر اس حقیقت کو محسوس کیا ہے اور اسلام کے قانونِ جزیہ کی حکمت تفصیل سے بیان کی ہے مولانا آزاد نے آیت کا ترجمہ یہ کیا ہے "یہاں تک کہ وہ اپنی خوشی سے جزیہ دینا قبول کریں اور حالت ایسی ہو جائے کہ ان کی سرکشی ٹوٹ چکی ہو"[۶۳]

یہ ترجمہ عام ترجموں سے مختلف ہے، اس لیے حواشی میں اسے مدلل کرنے کی کوشش کی ہے۔ فرماتے ہیں:

امام شافعیؒ نے کتاب الام میں تصریح کی ہے " سمعت عددا

من اہل العلم یقول الصغار ان یجری علیہم حکم الاسلام "

یعنی میں نے متعدد اہل علم سے سنا ہے کہ "وہم صاغرون" کا مطلب یہ ہے کہ ان پر اسلامی حکومت کے قوانین جاری ہو جائیں۔ یعنی وہ اسلامی حکومت کے قوانین کے آگے جھک جائیں"۔[۶۴]

یہی مطلب زیادہ مناسب اور قرآن کی مجموعی تعلیمات سے ہم آہنگ ہے۔

یوسفؑ کے بھائیوں کا جھوٹ

سورۂ یوسف میں ایک موقع کا بیان ہے کہ جب قحط کے ایام میں یوسفؑ کے بھائی غلہ لینے آئے تو حضرت یوسفؑ نے اپنے حقیقی بھائی بنیامن کے سامان میں پیالہ رکھ دیا۔ جب کارندوں نے اسے تلاش کیا تو وہ بنیامن کے سامان میں سے نکلا۔ اس پر ان کے سوتیلے بھائیوں نے کہا۔

اِنْ یَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ فَاَسَرَّهَا یُوْسُفُ فِیْ نَفْسِهٖ وَلَمْ یُبْدِهَا لَهُمْ (یوسف: ۷۷)

شاہ ولی اللہ نے یوسف کے بھائیوں کے اس قول کو امرِ واقعہ تسلیم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"یوسف علیہ السلام نے (بچپن میں) اپنی نانی کے یہاں ایک سونے کا بت چرالیا تھا تاکہ وہ بت پرستی سے باز رہیں یا اس قصہ کے مشابہ کوئی چیز چرائی تھی جو ان پر تہمت کا سبب بنی"۔ [۶۵]

مولانا ابوالکلام آزاد نے ایسے کسی واقعہ کی صحت سے انکار کیا ہے اور حضرت یوسف کے بھائیوں کے اس قول کو جھوٹ اور حسد پر محمول کیا ہے اور انصاف کی بات یہ ہے کہ مولانا آزاد کی توجیہ زیادہ مناسب اور برمحل ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

"جھوٹوں کا قاعدہ ہے کہ کوئی موقع، کوئی بات ہو جھوٹ بولنے سے نہیں رکتے، اگر مدح کا موقع ہو تو جھوٹی مدح کردیں گے، مذمت کا موقع ہو تو کوئی جھوٹا الزام لگادیں گے، جب بنیامن کی خرجی میں سے پیالہ نکل آیا تو بھائیوں کا سوتیلے پن کا حسد جوش میں آگیا، جھٹ بول اٹھے: اگر اس نے چوری کی تو کوئی عجیب بات نہیں، اس کا بھائی یوسف بھی چور تھا"، پس یہ بغض وحسد کی ایک بات تھی اس کا مطلب یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ واقعی کوئی ایسی بات ہوئی بھی تھی"۔ [۶۶]

اہلِ کتاب محمدؐ کی رسالت کو پہچانتے تھے

سورہ الانعام میں ہے اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَعْرِفُوْنَہٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَھُمْ (الانعام: ۲۰)

شاہ ولی اللہ نے آیت کا مفہوم یہ بیان کیا ہے "آنانکہ ایشاں را کتاب دادہ ایم می شناسند حقیقت قول را یعنی کلمۂ توحید" [۶۷] گویا یعرفونہ سے مراد توحید ہے یعنی اہلِ کتاب اپنی اولاد کی طرح توحید کی معرفت رکھتے تھے۔ جبکہ مولانا آزاد نے یعرفونہ سے مراد محمدؐ کی رسالت لی ہے اور یہی عام مفسرین کا خیال ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

"جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے یعنی یہود اور نصاریٰ وہ حقیقتِ حال سے بے خبر نہیں ہیں وہ اس کی سچائی یعنی پیغمبر اسلام کی سچائی اس طرح پہچان گئے ہیں جس طرح اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں"۔ [۶۸]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

واقعاتِ انبیاء کی توجیہ

شاہ ولی اللہ اور مولانا آزاد کے تفسیری مناہج میں فرق و امتیاز کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ شاہ صاحب نے انبیاء کرام سے متعلق واقعات کی تشریح و توجیہ فتح الرحمان میں روایتی انداز میں کی ہے جبکہ مولانا آزاد نے بالعموم عقلی اور اجتہادی انداز اپنایا ہے۔ مثال کے طور پر :

حضرت ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی تھی کہ تو مردوں کو کس طرح زندہ کرتا ہے مجھے دکھا دے، اللہ نے پوچھا کیا تمہیں ہماری قدرت پر ایمان نہیں؟ ابراہیمؑ نے کہا ایمان تو ہے مگر اطمینان قلب چاہتا ہوں، تب اللہ نے ارشاد فرمایا :

" فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا (البقرہ : ۲۶۰)

شاہ ولی اللہ نے وہی ترجمہ کیا ہے جو عام طور پر مفسرین کرتے ہیں یعنی "بگیر چہار عدد از پرندگان پس بہم آور ہمہ را نزدیک خود قطعہ قطعہ بعد ازاں بگذار بر ہر کوہے از ایشاں بعد ازاں ندا کن ایشاں را بیایند پیش تو شتاباں" شاہ صاحب نے ترجمہ میں "قطعہ قطعہ" کا اضافہ کیا ہے، اس میں اشارہ ہے کہ پرندوں کے ٹکڑے کیے جائیں، دیگر مفسرین نے اس کی مزید وضاحت کی ہے کہ ذبح کرکے ان کے ٹکڑے کرکے ان کے پارچے ملا لیے جائیں، پھر ان کو پہاڑوں پر رکھا جائے"۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے یہاں مطالبۂ ابراہیم میں حیات سے مراد دعوتِ حق سے مردہ قوموں کا زندہ ہو جانا ہے، نہ کہ حقیقی موت و حیات۔ مولانا لکھتے ہیں :

" حضرت ابراہیمؑ کا ظہور ایک ایسے عہد میں ہوا تھا، جبکہ ان کے ملک میں اور ان کے ملک سے باہر کوئی گروہ بھی ایسا نہ تھا جس میں قبولِ حق کی استعداد دکھائی دیتی ہو، یہ حالت دیکھ کر انھوں نے کہا خدایا تو کیوں کر اس موت کو زندگی سے بدل دے گا؟ اس پر اللہ نے دعوتِ حق کی انقلاب انگیز حقیقت پرندوں کی مثال سے واضح کر دی، اگر تم ایک پرند کو کچھ دنوں تک اپنے پاس رکھ کر ایسا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تربیت یافتہ بنا سکتے ہو کہ تمہاری آواز سنتا اور تمہارے بلانے پر اڑتا ہوا آجا سکتا ہے تو گمراہ اور متوحش انسان دعوت کی تفہیم و تربیت سے اس درجہ اثر پذیر نہیں ہو سکتے کہ تمہاری صدائیں سنیں اور ان کا جواب دیں"۔ ۶۹ھ

مولانا آزاد کی یہ تفسیر دوراز کار معلوم ہوتی ہے، ایک جلیل القدر نبی اللہ سے یہ مطالبہ کیوں کرے گا کہ تو شرک سے ایمان کی طرف لوگوں کو کس طرح لائے گا جب کہ نبی کو مبعوث اسی کام کے لیے کیا گیا ہے۔ ہاں وہ اگر مردوں کو زندہ کرنے کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہے تو اس کا مطالبہ قابل فہم ہے اور یہ ویسا ہی مطالبہ ہے جو ایک دوسرے نبی نے اللہ سے کیا تھا جس کا تذکرہ پہلے کی آیت اَنّٰی یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا میں موجود ہے۔

سورہ الانبیاء: ۷۸ میں ہے:

وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيهِ غَنَمُ الْقَوْمِ

شاہ صاحب نے اس آیت کا پس منظر یہ بیان کیا ہے کہ:

"ایک گروہ کی بکریاں دوسرے گروہ کے کھیت میں رات کے وقت گھس کر کھیت چر گئیں حضرت داؤد نے بکریاں کھیت والے کے حوالہ کرنے کا فیصلہ کیا اور حضرت سلیمانؑ نے بکری والے کو کھیت کی کاشت درست کرنے اور اس وقت تک کھیت والے کے لیے بکریوں کا دودھ استعمال کرنے کا فیصلہ کیا"۔ ۷۰ھ

مولانا آزاد نے آیت کے اس مفہوم کا اگرچہ انکار نہیں کیا ہے، مگر ترجمہ اور تشریح میں ایک دوسرا مفہوم بیان کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"اگر ایک آدمی ایک طرف کھیت بوئے، دوسری طرف رات کے وقت اپنی بکریاں بھی کھول دیا کرے تو کیا نتیجہ نکلے گا۔ یہی کہ ساری فصل تباہ ہو جائے گی، وہ جتنا چر سکیں گی چر لیں گی جتنا روند سکیں گی روند جائیں گی۔ یہی حال یہودیوں کا تھا وہ ایک طرف بناتے تھے، دوسری طرف خود اپنے ہی ہاتھوں اسے اجاڑ دیتے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھے حضرت داؤد نے انھیں فلسطینیوں پر فتح مند کرایا اور تمام ملک ساحلِ بحر تک ان کے قبضہ میں آگیا، لیکن پھر بھی ان میں نظم و اطاعت کی روح پیدا نہ ہوئی، البتہ حضرت سلیمانؑ کے زمانہ میں ایک نیا انقلاب رونما ہوا اور انھوں نے اپنی دانش و حکمت و نبوت سے یہودیوں کی حالت ایسی پلٹ دی کہ ایک عظیم الشان عبرانی مملکت قائم ہوگئی"۔ [اکھ]

خواتین کے حقوق

ہر مصنف اپنے زمانے کے علمی شعور، تہذیبی و تمدنی سرگرمیوں اور سماجی تبدیلی کا کسی نہ کسی درجہ میں اثر قبول کرتا ہے اور اس کی علمی کاوشوں میں اس کی جھلک کم و بیش نظر آتی ہے۔ مولانا آزاد اور شاہ صاحب بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ اس لیے ان بزرگوں کی تفسیری کاوشوں کی معنویت اور قدر و قیمت کا تجزیہ کرتے وقت ان دونوں کے عہد اور علمی، سیاسی اور سماجی حالات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔ ایک ہی حقیقت کی دونوں ترجمانی کرتے ہیں مگر دونوں الگ رخ اور جہت پر زور دیتے ہیں، وقت اور حالات نوکِ قلم کو خود بخود اپنی طرف موڑ لیتے ہیں۔ شاہ صاحب کے عہد کا مسلم معاشرہ جامد و ساکن اور مولانا آزاد کا ماحول گوناگوں علمی ترقیوں اور سیاسی و سماجی تبدیلیوں کا ہے۔ نئے علوم و افکار اور تجربوں کا ہے، اس کا انعکاس ان کی تفسیری کاوشوں میں بھی ملتا ہے۔ مثال کے طور پر آیتِ کریمہ ملاحظہ ہو:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (البقرہ: ۲۲۸)

شاہ صاحب نے اس آیت کا سادہ سا معروف مطلب بیان کیا ہے

"زنان را بر مرداں حق است چنانچہ مردان را بر زناں حق است" [۷۲]

جب کہ مولانا آزاد نے یہاں ایک تفصیلی بحث حقوقِ نسواں پر کی ہے تاریخ میں عورت کا مقام، مذاہب کا ان کے بارے میں رویّہ اور اسلام کے عطا کردہ حقوق پر سیر حاصل گفتگو کی ہے، وہ لکھتے ہیں "قرآن نے چار لفظ کہہ کر "وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ" انسان کی معاشرتی زندگی کے سب سے بڑے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انقلاب کا اعلان کر دیا تھا۔ ان چار لفظوں نے عورت کو وہ سب کچھ دے دیا جو اس کا حق تھا مگر جو اسے کبھی نہیں ملا تھا، ان لفظوں نے اسے محرومی و شقاوت کی خاک سے اٹھایا اور عزت و مساوات کے تخت پر بٹھا دیا۔ پھر اسلوب بیان کی جامعیت اور مانعیت پر غور کرو، زندگی و معاشرت کی کون سی بات ہے جو ان چار لفظوں میں نہیں آگئی اور کون سا رخنہ ہے جو بند نہیں کر دیا گیا" ۳۳

اسی کے بالمقابل سورۃ النساء کی آیت ہے" اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰہُ بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ وَّبِمَا اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِھِمْ (النساء: ۳۴)

شاہ صاحب نے اس آیت کی تفسیر میں عورتوں پر مرد کے نگراں ہونے کا سبب مرد کی فطری اور جبلی برتری بیان کیا ہے، ان کے الفاظ ہیں" بسبب آنکہ مراں دراصل جبلت برتر اند از زناں" ۳۴

مولانا ابوالکلام آزاد نے اس آیت کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "مرد عورتوں کے لیے کارفرما ہوئے، اس لیے کہ اللہ نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی اور اس لیے کہ مرد اپنا مال جو ان کی محنت سے جمع ہوتا ہے عورتوں پر خرچ کرتے ہیں یعنی خاندانی زندگی کا نظام قائم نہیں ہو سکتا اگر کوئی فرد اس کا قوام یعنی بندوبست کرنے والا نہ ہو، یہ "قوام" ہستی کس کی ہوئی؟ شوہر کی یا بیوی کی؟ قرآن کہتا ہے خاندانی زندگی کا نظام اس طرح چل رہا ہے کہ قوام ہستی کی جگہ شوہر کی ہوئی۔ پس اتنا ہی امتیاز ہے جو مرد کو عورت کے مقابلہ میں حاصل ہے، بشرطیکہ اس امتیازی ذمہ داری کو جو سر تا سر ایک بوجھ ہے، وجہ امتیاز حاصل کر لیا جائے ظاہر ہے کہ اس امتیاز سے مردوں کو کوئی پیدائشی امتیاز حاصل نہیں ہو جاتا محض خاندانی نظام کا ایک ڈھنگ ہے جس نے یہ جگہ اسے دلا دی ہے"۔ ۳۵

مولانا آزاد کی مذکورہ دونوں وضاحتوں پر غور کیجئے، اور پھر اس عہد کو دیکھئے جب یورپ میں آزادئ نسواں کی تحریک زور شور سے چل رہی تھی، زندگی کے ہر میدان میں مساوات مرد و زن کے آوازے بلند ہو رہے تھے اور اس کی بازگشت نہ صرف

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اقوام متحدہ کے حقوقِ انسانی کے منشور میں سنائی دیتی تھی بلکہ مسلم ممالک بالخصوص مصر میں مسلم دانشوروں کی تحریروں اور تحریکوں میں اس کی جھلک نظر آتی تھی۔ اسی پس منظر میں مولانا آزاد نے مصری مصنف فریدی وجدی کی کتاب "المرأة المسلمہ" کا اردو ترجمہ کیا۔ یہی ذہنی پس منظر ہے جس میں انھوں نے حقوقِ نسواں کے سلسلہ میں قرآن کریم کی آیتوں کی حکمت دعہد حاضر میں ان کی معنویت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ مولانا آزاد نے اس سلسلہ میں زیادہ مفصل بحث سورہ یوسف کی آیت "اِنَّ کَیْدَ کُنَّ عَظِیْمٌ" کے تشریحی نوٹ میں کی ہے۔

جدید علمی تحقیقات

شاہ ولی اللہ اور مولانا آزاد کے مناہجِ تفسیر میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ شاہ صاحب کی تشریح کی بنیاد قدیم علوم و معارف پر ہے کیوں کہ علومِ جدیدہ یا نئی تحقیقات ان کے عہد میں سامنے نہ آئی تھیں۔ اس کے برخلاف مولانا آزاد کو وہ دور ملا جس میں تازہ معلومات، جدید تحقیقات اور اثری انکشافات سامنے آرہے تھے اور ان سے قرآنی واقعات کو سمجھنے میں مدد مل رہی تھی۔ مولانا آزاد کی اس جدید مواد پر نظر بھی تھی اور قرآن کریم کی ترجمانی میں انھوں نے اس کا پورا استعمال بھی کیا ہے۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں۔

"علم و نظر کی راہوں میں آج کل قدیم و جدید کی تقسیم کی جاتی ہے، لیکن میرے لیے یہ تقسیم بھی کوئی تقسیم نہیں۔ جو کچھ قدیم ہے وہ مجھے ورثہ میں ملا ہے اور جو کچھ جدید ہے اس کے لیے اپنی راہیں آپ نکالیں۔ میرے لیے وقت کی جدید راہیں بھی ویسی ہی دیکھی بھالی ہیں جس طرح قدیم راہوں میں گام فرسائی کرتا رہا ہوں۔"[٢٦]

اصحابِ رقیم

ماحول اور عہد کی وجہ سے قدیم و جدید کا یہ فرق فتح الرحمان اور ترجمان القرآن میں بھی نظر آتا ہے۔ قرآن کریم میں اصحاب کہف کو اصحاب رقیم بھی کہا گیا ہے۔

"اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحَابَ الْکَہْفِ وَالرَّقِیْمِ کَانُوْا مِنْ اٰیٰتِنَا عَجَبًا (الکہف: ۹)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شاہ صاحب اور دیگر مفسرین نے رقیم کا مطلب، تحریر، اور مکتوب بیان کیا ہے، شاہ صاحب کہتے ہیں کہ "نوشتہ کہ دیوار غار" ۲۵ مگر مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ رقیم ایک شہر کا نام تھا جس میں یہ غار واقع تھا، مولانا آزاد نے اس تشریح کو جدید اثری تحقیقات Archeology کی مدد سے تفصیل مدلل کیا ہے۔ مولانا آزاد کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ "بعض ائمہ تابعین نے اس کا یہی مطلب سمجھا تھا کہ یہ ایک شہر کا نام ہے لیکن چونکہ اس نام کا کوئی شہر عام طور پر مشہور نہ تھا، اس لیے اکثر مفسرین اس طرف چلے گئے ہیں کہ یہاں رقیم کے معنی کتاب کے ہیں یعنی ان کے غار پر کوئی کتبہ لگا دیا گیا تھا، اس لیے کتبہ والے مشہور ہو گئے۔ لیکن انھوں نے تورات کی طرف رجوع کیا ہوتا تو معلوم ہو جاتا کہ "رقیم" وہی لفظ ہے جسے تورات میں راقیم کہا گیا ہے اور یہ فی الحقیقت ایک شہر کا نام تھا جو آگے چل کر بیٹرا کے نام سے مشہور ہوا، اور عرب اسے بطرا کہنے لگے۔

عالم گیر جنگ کے بعد آثارِ قدیمہ کی تحقیقات کے جو نئے گوشے کھلے ہیں ان میں ایک "بیٹرا" بھی ہے اور اس کے انکشافات نے بحث و نظر کا ایک نیا میدان مہیا کر دیا ہے۔ اس انکشاف کے بعد قدرتی طور پر یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ اصحابِ کہف کا واقعہ اسی شہر میں پیش آیا تھا اور قرآن نے صاف صاف اس کا نام الرقیم بتلا دیا ہے اور جب اس نام کا ایک شہر موجود تھا تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ رقیم کے معنی میں تکلفات کیے جائیں اور بغیر کسی بنیاد کے اسے کتبہ پر محمول کیا جائے ۲۶

یہاں ضمناً اس بات کا ذکر کرنے میں کوئی حرج نہیں محسوس ہوتا کہ مولانا مودودی نے مولانا آزاد کی اس تحقیق سے اختلاف کیا ہے۔ وہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ جدید زمانہ کے محققینِ آثارِ قدیمہ نے یہ بات ماننے میں سخت تامل کیا ہے کہ بیٹرا اور راقم ایک چیز ہیں۔ مزید فرماتے ہیں ہمارے نزدیک صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ رقیم سے مراد کتبہ ہے۔ (تفہیم القرآن ج ۳ ص ۱۱ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی) ۲۷

علمِ جنین

رحمِ مادر میں بچہ کی تخلیق سے متعلق قرآن کریم میں ارشاد ہے:

ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ
اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ (المومنون: ۱۴)

اس آیت میں "خلقاً آخر" کی تشریح شاہ صاحب نے کی ہے 'روح پھونکنا اور ناخن اور بال کا اگنا'۔ ۷۹

مولانا ابوالکلام آزاد نے رحمِ مادر میں جنین کے ارتقائی مراحل پر علمِ جنین کی جدید تحقیقات کی مدد سے سیر حاصل بحث کی ہے، وہ مذکور تشریح کے بارے میں کہتے ہیں:

"چوں کہ مراتبِ پیدائش کی کوئی ایسی انقلابی حالت ہمارے مفسّروں کے سامنے نہ تھی اس لیے قدرتی طور پر اس کی کوئی جمتی ہوئی تفسیر ان سے بن نہ آئی اور مختلف وادیوں میں نکل گئے، بعضوں نے کہا: اس سے مقصود نفخِ روح کی حالت ہے، کیوں کہ اس مرتبے سے پہلے روح نہیں ہوتی، بعضوں نے کہا: یہ شکمِ مادر سے باہر نکلنے کی طرف اشارہ ہے، کیوں کہ وضعِ حمل اسی کے بعد ہوتا ہے، بعضوں نے کہا: مقصود بالوں کا پیدا ہونا ہے، اس سے پہلے بال نہیں ہوتے۔" ۸۰

مولانا آزاد ایسی تمام توجیہات کی، جو قدیم اور جدید مفسرین نے کی ہیں، کمی بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"اگر اس مقام کی تشریح و تحقیق کا حق ادا نہ ہو سکا تو اسے مفسّروں کے قصورِ فہم پر محمول نہیں کرنا چاہیے کیوں کہ اس باب میں وہ یقیناً معذور تھے، علم و تحقیق کا یہ گوشہ تمام تر زمانہ حال کی پیداوار ہے اور زمانۂ حال میں بھی سب سے آخری عہد کی پیداوار۔ انیسویں صدی کا ابتدائی زمانہ جو علومِ حدیثہ کے انکشاف و تکمیل کا سب سے زیادہ شاندار زمانہ ہے، پورا گزر گیا اور کارخانۂ فطرت کے اس گوشۂ مستور کے تمام حجاب نہ اٹھ سکے۔ پس اگر اٹھارہویں صدی کے حکماء معذور تصوّر کیے جا سکتے ہیں کہ اس بارے میں بالکل غلط رخ پر جا رہے تھے، حالانکہ خوردبین ایجاد ہو چکی تھی اور انسانی نعش کی تشریح کا بابِ مسدود کھل چکا تھا تو ظاہر ہے نویں اور دسویں صدی کے مفسرینِ قرآن کیوں نہ معذور تصوّر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیے جائیں"۔[۸۱]

بلا شبہ مولانا آزاد نے نئی علمی تحقیقات سے جو استفادہ کیا ہے اور تشریحِ آیت میں ان سے جو مدد ملی ہے وہ بڑی اہمیت کی حامل ہے، مگر ایک سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ کیا انیسویں صدی کی تحقیقات کے سامنے آنے سے پہلے جملہ مفسرین آیت کا مفہوم نہ سمجھ سکے؟ اور یہ پورے ایک ہزار سال کا طویل زمانہ آیتِ الٰہی کا صحیح مفہوم سمجھنے والے علماء و مفسرین سے خالی رہا؟

شاہ صاحب پر تنقید

مولانا ابوالکلام آزادؒ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے متاثر ضرور ہیں مگر ان کے مقلد نہیں یہی وجہ ہے کہ وہ شاہ صاحب کے بہت سے تفسیری خیالات سے نہ صرف اختلاف کرتے ہیں، بلکہ ان پر برملا تنقید کرتے ہیں، اگرچہ اس تنقید میں عمومی لب ولہجہ اختیار کرتے ہیں، صراحتاً شاہ صاحب کا نام نہیں لیتے۔ مثلاً

حق اور ہدایت

سورہ یونس کی آیت ہے قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَائِكُمْ مَنْ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ قُلِ اللَّهُ يَهْدِي لِلْحَقِّ أَفَمَنْ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ أَحَقُّ أَنْ يُتَّبَعَ أَمَّنْ لَا يَهِدِّي إِلَّا أَنْ يُهْدَى فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ۔ (یونس: ۳۵)

بگو آیا ہست از شریکان شما کسے کہ راہ نماید بسوئے دین حق۔ بگو خداست کہ راہ نماید بسوئے حق لائق تر است بانکہ پیروی کردہ شود یا کسے کہ خود راہ نمی یابد مگر آں وقت کہ راہ نمودہ شود۔[۸۲]

دیگر مفسرین نے بھی بالعموم ہدایت سے ہدایتِ الٰہی اور حق سے دینِ حق مراد لیا ہے۔ جبکہ مولانا آزاد کے نزدیک "یہاں ہدایت سے مقصود وحی نہیں ہے بلکہ وجدان و حواس اور عقل کی ہدایت ہے اور حق سے مقصود دینِ حق نہیں ہے بلکہ لغوی معنی یعنی سچا راستہ، درست راستہ"۔[۸۳]

مولانا آزاد ان مفسرین پر سخت تنقید کرتے ہیں جو یہاں ہدایت سے مراد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہدایت وحی اور حق سے مراد دینِ حق لیتے ہیں اور وہ اس تفسیر کو ان مفسرین کا قصورِ فہم سمجھتے ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"یہ مقام قرآن کے مہمّاتِ دلائل میں سے ہے اور ضروری ہے کہ اسے اچھی طرح سمجھ لیا جائے، چونکہ اس آیت میں ہدایت اور حق کے الفاظ آئے ہیں، اس لیے مفسرین نے خیال کیا کہ ہدایت سے مقصود ہدایتِ وحی ہے اور حق سے مقصود دینِ حق۔ اور فارسی و اردو کے تمام مترجموں نے بھی انھیں کی پیروی کی، نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن کے استدلال کی ساری حقیقت مفقود ہو گئی اور آیت کا مطلب بھی کچھ سے کچھ ہو گیا۔ اس طرح تمام مقامات دیکھ کر سخت حیرانی ہوتی ہے کہ متاخرین کا معیارِ نظر و مطالعہ کیوں اس درجہ پست ہو گیا تھا کہ قرآن کے صاف و صریح مطالب سے بھی آشنا نہ ہو سکے"۔[۸۴]

سامری کی گوسالہ پرستی

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کی پکار پر گئے اور اپنی قوم کی نگرانی حضرت ہارونؑ کے سپرد کی تو اس عرصہ میں سامری نے ایک بچھڑا بنا کر پوری قوم کو اس کی پرستش کی دعوت دی۔ سفر سے واپسی پر موسیٰؑ نے سامری سے جواب طلب کیا تو انھوں نے کہا۔

بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ (طٰہٰ: ۹۶)

شاہ صاحب نے اس کا ترجمہ و مطلب یہ بیان کیا ہے:

"میں نے وہ چیز دیکھی جو سارے لوگوں نے نہیں دیکھی، پس میں نے ایک مٹھی مٹی جبریل کے نقشِ قدم سے اٹھائی اور اسے ڈال دیا، اسی طرح میرے نفس نے میرے سامنے پیش کیا۔"

تشریح میں شاہ صاحب نے یہ اضافہ کیا ہے "یعنی اس ڈھانچہ میں ڈال دیا جو گوسالہ کی شکل میں سونے کا بنایا تھا"۔[۸۵]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مولانا آزاد نے ترجمہ کیا ہے :

"میں نے وہ بات دیکھ لی تھی جو اوروں نے نہیں دیکھی اس لیے اللہ کے رسول (موسیٰ) کی پیروی میں میں نے بھی کچھ حصہ لیا تھا، پھر چھوڑ دی (کیا کہوں) میرے جی نے ایسی ہی بات مجھے سُجھائی۔"[۸۶]

مولانا آزاد نے تشریح میں ان لوگوں پر سخت تنقید کی ہے جنھوں نے رسول سے مراد فرشتہ اور 'قبضة من اثر الرسول' کا مطلب فرشتہ کے نقشِ قدم کی مٹی لی ہے۔ اور اسے یہود کی کہانی قرار دیا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں :

"افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ کہانی تفسیر کی روایتوں میں بھی شامل ہوگئی اور اثر الرسول کا مطلب یہ بنالیا کہ "جبریل کے نقشِ قدم" کی ایک مشتِ خاک سامری نے اٹھالی تھی، لیکن یاد رہے کہ یہ تفسیر کسی بھی طرح صحیح نہیں ہوسکتی، اتنا ہی نہیں بلکہ ایسی تفسیر کرنا قرآن کے اس مقام کو مضحکہ انگیز حد تک بے معنی بنا دینا ہے۔"[۸۷]

مولانا آزاد نے اس کو تفصیلی دلائل سے ثابت کرنے کی سعی کی ہے۔

الساعۃ کا مفہوم

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ (الحجر: ۸۵)

شاہ صاحب نے اس آیت میں "الساعۃ" کا ترجمہ قیامت کیا ہے۔ مگر مولانا آزاد نے اس پر نقد کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"قرآن میں الساعۃ کا لفظ کہیں تو روزِ قیامت کے لیے بولا گیا ہے۔ کہیں ایک ایسے فیصلہ کن دن کے لیے جو دعوتِ حق اور اس کے مخالفوں کے درمیان فیصلہ کر دے گا، اس آیت میں "الساعۃ" سے مقصود ایسا ہی دن ہے، قیامت کا دن نہیں جیسا کہ اکثر مفسروں اور مترجموں نے قرار دیا ہے۔"[۸۸]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شاہ صاحب کا امتیاز

بعض مقامات پہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کی معنی آفرینی کی کوششوں کے باوجود آیت کی تشریح شاہ صاحب کی تفسیر سے فروتر ہے۔

قصۂ یوسف میں ہے کہ جب حضرت یوسفؑ کو قید سے نکالنے کے لیے بادشاہ کا ایلچی آتا ہے تو حضرت یوسف قاصد کو یہ کہہ کر واپس کر دیتے ہیں کہ اپنے آقا سے ان عورتوں کی سرگزشت پوچھو جنھوں نے اپنی انگلیاں کاٹ لی تھیں۔ بادشاہ نے ان عورتوں کو بلا کر پوچھا تو انھوں نے کہا کہ یوسف معصوم ہیں۔ تب عزیزِ مصر کی بیوی نے اقرار کر لیا کہ آج سچی بات ظاہر ہو گئی، ہاں میں نے یوسف کو پھسلایا تھا اور وہ راست باز تھا۔ اس منظر کے بعد دو آیتیں ہیں۔

ذَالِكَ لِيَعْلَمَ أَنِّي لَمْ أَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَأَنَّ اللهَ لَا يَهْدِي كَيْدَ الْخَائِنِينَ وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِي إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّي إِنَّ رَبِّي غَفُورٌ رَّحِيمٌ (۵۲-۵۳)

مولانا آزاد نے ان دونوں آیتوں کا ترجمہ کیا ہے:

"یہ میں نے اس لیے کہا کہ اسے معلوم ہو جائے (یعنی یوسف کو معلوم ہو جائے) کہ میں نے اس کے پیٹھ پیچھے اس کے معاملہ میں خیانت نہیں کی نیز اس لیے کہ (واضح ہو جائے) اللہ خیانت کرنے والوں کی تدبیروں پر کبھی (کامیابی کی) راہ نہیں کھولتا۔ میں اپنے نفس کی پاکی کا دعویٰ نہیں کرتی، آدمی کا نفس تو برائی کے لیے بڑا ہی ابھارنے والا ہے (اس کے غلبہ سے بچنا آسان نہیں) مگر ہاں اسی حال میں کہ میرا پروردگار رحم کرے بلاشبہ میرا پروردگار بڑا ہی بخشنے والا بڑا ہی رحم کرنے والا ہے۔" [۸۹]

شاہ ولی اللہ نے مذکورہ دونوں آیتوں کو زوجۂ مصر کے بجائے حضرت یوسفؑ کا قول بتایا ہے اور اس آیت سے کلام کو جوڑا ہے جس میں حضرت یوسف نے بادشاہِ مصر سے کہا ہے کہ ان عورتوں سے میرے جرم بے گناہی کی تفصیل معلوم کریں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جس کے الزام میں مجھے قید کی سزا دی گئی، جب تک وہ الزام رفع نہ ہو جائے میں قید خانہ سے نہیں جاؤں گا۔ اور اگلی دو آیتیں اسی قول کی وضاحت حکمت اور عظمت کی شہادت کے لیے ہیں۔ "(دگفت یوسف) ایں ہمہ برائے آنست تا بداند عزیز کہ من خیانت او نکردم غائبانہ و بداند کہ خدا راہ نمی نماید خیانت کنندگان"۔[۵۹] یہی معنی عام طور پر مفسرین نے لیا ہے۔

مولانا آزاد نے محض کلام کے تسلسل کا خیال رکھتے ہوئے مذکورہ دونوں آیتوں کو ماقبل کی آیت کا حاصل بنا دیا، اگرچہ اس سلسلے میں ان کے پیش رو ابن تیمیہ اور ابن کثیر جیسے جلیل القدر مفسرین ہیں، مگر موقع کلام کی نزاکت اور واقعہ کی داخلی شہادت مولانا آزاد کی ترجمانی کو کمزور اور شاہ صاحب کی ترجمانی کو مضبوط ثابت کرتی ہے۔

عزیز مصر کی بیوی کیسے کہہ سکتی ہے کہ یوسف کو معلوم ہو جائے کہ اس کی خیانت نہیں کی۔ اس سے بڑی خیانت اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک پاک نفس نوجوان کا دامن عصمت داغ دار کرنے کی سعی کی۔ پھر اس پر جھوٹا الزام لگایا اور پھر اپنے اثرات کا استعمال کر کے قید و بند کی سزا دلا دی۔ پھر وہ کس منہ سے کہہ سکتی تھی کہ میں اپنے نفس کی برأت نہیں کرتی جبکہ بے شرمی، شہوت پرستی اور غرور کے سارے مظاہرے کر ڈالے۔ یہ دونوں باتیں صرف حضرت یوسفؑ کی عصمت و عظمت کی تصویر کشی کرتی ہیں اور انہی کو زیب دیتی ہیں۔ حضرت یوسفؑ نے بادشاہ سے الزام کی ازسرنو تحقیقات اس لیے کرائی کہ عزیز مصر کو معلوم ہو جائے کہ جس نوجوان کو انھوں نے بیٹے کی طرح عزت و احترام سے گھر میں رکھا تھا اس نے اس کے غائبانہ میں کوئی خیانت نہیں کی پھر یہ کہ میں انسان ہوں اور انسان کے ساتھ اس کا نفس لگا رہتا ہے، مگر میرے ساتھ میرے رب کی مہربانی رہی جو ہر نازک مرحلہ میں میری رہنمائی کرتی رہی۔ یہ آیت وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا أَنْ رَّأَىٰ بُرْهَانَ رَبِّهِ کا خوبصورت اعتراف اور اظہار ہے۔ ایسے بلند اور پاکیزہ کلام کا کہنے والا وہی ہو سکتا ہے جس کا کردار بھی پاکیزہ اور بلند رہا ہو اور وہ حضرت یوسف ہیں نہ کہ عزیز مصر کی بیوی۔

مولانا آزاد کا امتیاز

بعض مقامات پر مولانا آزاد کا ترجمہ و تشریح شاہ صاحب کے مقابلہ میں زیادہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

معنی خیز اور سیاق وسباق سے ہم آہنگ معلوم ہوتا ہے۔ مثال کے لیے دیکھیے:

اَلْیَوْمَ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ وَطَعَامُ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ حِلٌّ لَّکُمْ وَطَعَامُکُمْ حِلٌّ لَّهُمْ (المائدہ ۵:۵)

اس آیت کا مولانا آزاد نے ترجمہ کیا ہے۔

"آج (کہ دینِ حق اپنے ظہور میں کامل ہوگیا ہے) تمام اچھی چیزیں تم پر حلال کردی گئی ہیں (جو بے جا قیدیں لوگوں نے لگا رکھی تھیں سب دور ہوگئیں) ان لوگوں کا کھانا جنھیں کتاب دی گئی ہے تمہارے لیے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لیے حلال ہے۔"[۹۱]

اس جگہ شاہ صاحب ایک دوسرا مفہوم بیان کرتے ہیں:

"یعنی جو کچھ اہل کتاب کے لیے حلال تھا وہ تمہارے لیے بھی حلال ہے مثلاً گائے اور بکری اور جو کچھ تمہارے لیے حلال کیا گیا مثلاً اونٹ اور نا خون والے جانور وہ ان لوگوں کے لیے بھی حلال ہے جو ان لوگوں میں سے ایمان لائے اور یہود ونصاریٰ کے قبیلوں کا اس باب میں اعتبار نہیں۔"[۹۲]

مولانا آزاد کی تشریح جمہور مفسرین سے ہم آہنگ اور زیادہ معنویت کی حامل ہے، جبکہ شاہ ولی اللہ کی تشریح میں نکتہ آفرینی تو بے شک ہے مگر اقتضاء کلام دوسرا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسلام لانے کے بعد پچھلی تمام چیزیں ختم ہوجاتی ہیں اور اسلام لانے والا کسی بھی رنگ ونسل یا فرقہ ومذہب سے ہو اس پر وہی احکام نافذ ہوتے اور اس کے وہی حقوق ہوتے ہیں جو عام مسلمانوں کے ہوتے ہیں، اس میں اہلِ کتاب کی کوئی تخصیص نہیں۔ اب اس جملہ کی کوئی اہمیت نہیں رہتی کہ تمہارا کھانا ان کے لیے اور ان کا کھانا تمہارے لیے حلال ہے۔ آیت کی معنویت تو اس وقت روشن ہوتی ہے جب یہ کہا جائے کہ مشرکانہ وملحدانہ مذہب کے مقابلہ میں یہ اہلِ کتاب یہود ونصاریٰ ہیں جن کا کھانا یعنی ذبیحہ تمہارے لیے حلال کیا گیا ہے کیونکہ اسی آیت میں اہلِ کتاب کی عورتوں سے بھی نکاح کرنے کی اجازت دی گئی ہے جبکہ مشرک عورتوں سے نکاح کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آخر میں شاہ ولی اللہ اور مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمہ کا فرق و امتیاز سمجھنے کے لیے چند آیتوں کے تراجم کو بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے، اہلِ نظران کا محاکمہ خود کر سکتے ہیں۔

آیات	فتح الرحمٰن	ترجمان القرآن
(۱) وَاَخَذْنَا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍ بَئِیْسٍ (الاعراف: ۱۶۵)	وگرفتار کردیم ستم کاراں را بعذاب سخت	شرارت کرنے والوں کو ایک ایسے عذاب میں ڈالا کہ محرومی و نامرادی میں مبتلا کرنے والا عذاب تھا۔
(۲) وَتَكُوْنُوْا مِنْ بَعْدِهٖ قَوْمًا صَالِحِیْنَ (یوسف: ۹)	تا باشید بعد ازیں گروہے شائستہ (یعنی توبہ کنید)	اور اس کے (یوسف کے) نکل جانے کے بعد ہمارے سارے کام سدھر جائیں۔
(۳) قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِیًّا (مریم-۲۴)	پیدا کردہ است پروردگار تو پائیں تو جوئے (چشمہ)	تیرے پروردگار نے تیرے تلے ایک بڑی ہستی پیدا کردی ہے۔
(۴) وَثِیَابَكَ فَطَهِّرْ (المدثر: ۴)	و جامہائے خود را پاک ساز	اور اپنے قلب کو پاکیزہ رکھو۔

حواشی

۵۶ الفوز الکبیر ص ۷۸ — ۵۷ ترجمان القرآن ۱/۳۸، دیباچہ — ۵۸ ایضاً ۴/۱۷ تا ۲۲۳

۵۹ ترجمان القرآن ۳/۱۷ — ۶۰ فتح الرحمٰن، النساء- ۵۸ — ۶۱ ترجمان القرآن ۲/۷۹۴

۶۲ فتح الرحمٰن، التوبہ- ۲۹ — ۶۳ ترجمان القرآن ۳/۲۶۱ — ۶۴ ایضاً ۸۹۲ حواشی

۶۵ فتح الرحمٰن، یوسف- ۷۷ حاشیہ — ۶۶ ترجمان القرآن ۲/۱۱ — ۶۷ فتح الرحمٰن، الانعام- ۲۰

۶۸ ترجمان القرآن ۲/۱۱ — ۶۹ ایضاً ص ۲۳۹ — ۷۰ فتح الرحمٰن، الانبیاء- ۷۸

۷۱ ترجمان القرآن ۴/۷۰۹ — ۷۲ فتح الرحمٰن، البقرہ ۲۲۸ — ۷۳ ترجمان القرآن ۲/۱۸۹

۷۴ فتح الرحمٰن، النساء- ۳۴ — ۷۵ ترجمان القرآن ۲/۱۹۰ — ۷۶ ایضاً ۱/۵۲ دیباچہ

۷۷ فتح الرحمٰن، الکہف- ۹ — ۷۸ ترجمان القرآن ۴/۴۰۶ — ۷۹ فتح الرحمٰن، المؤمنون- ۱۴

۸۰ ترجمان القرآن ۴/۹۲۸ — ۸۱ ایضاً ص ۹۲۹ — ۸۲ فتح الرحمٰن، یونس- ۳۵

۸۳ ترجمان القرآن ۳/۵۸۷ — ۸۴ ایضاً ص ۵۸۵ — ۸۵ فتح الرحمٰن- طٰہٰ- ۹۶

۸۶ ترجمان القرآن ۴/۶۳۴ — ۸۷ ایضاً ص ۶۶۷ — ۸۸ ایضاً ص ۱۲۲

۸۹ ایضاً ۳/۶۵-۷۴ — ۹۰ فتح الرحمٰن، یوسف- ۵۲ — ۹۱ ترجمان القرآن ۲/۵۹۳

۹۲ فتح الرحمٰن، المائدہ- ۵

© rasailojaraid.com